جائے تو مولانا مودودی نے جو کچھ لکھا تھا وہ غلط نہ تھا۔ تاہم مدیر البلاغ اگر اس کی تردید ضروری سمجھتے تھے تو انہیں چاہیے تھا کہ وہ کم از کم یہ تصریح تو کر دیتے کہ چار کتابوں میں بات وہی درج ہے جو مولانا مودودی نے نقل کی ہے، البتہ پانچویں کتاب میں بیت المال کے الفاظ ہیں۔ لیکن مدیر البلاغ نے محرم ۱۳۸۹ھ کے پرچے میں چار کتابوں کو چھوڑ کر صرف ایک البدایہ کا حوالہ نقل کر دیا جس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ امیر معاویہؓ نے سونا چاندی بیت المال کے لیے جمع کرنے کا حکم دیا تھا۔ اس سے "البلاغ" پڑھنے والا یہی تأثر لے سکتا تھا کہ مولانا مودودی نے امیر معاویہؓ اور ان مؤرخین کی طرف ایک بالکل غلط اور بے بنیاد بات منسوب کر دی ہے۔ میں نے اس کے جواب میں یہ ثابت کیا تھا کہ باقی چاروں مؤرخ جو ابن کثیر (صاحب البدایہ) سے متقدم تھے، ان سب نے لَہٗ کے الفاظ لکھے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ خلافتِ راشدہ کے بعد خلفاء کے ذاتی خزانے اور بیت المال میں کوئی خطِ امتیاز باقی نہ رہا تھا۔ اس صورتِ حال کی کچھ تشریح میں نے اسی بحث میں کر دی تھی اور مزید وضاحت گزشتہ ماہ کے ترجمان میں ہو چکی ہے۔

مولانا عثمانی صاحب تازہ البلاغ میں پھر اسی ایک حوالے کے بل پر فرماتے ہیں کہ مولانا مودودی کے لیے جائز نہیں تھا کہ وہ البدایہ کے حوالے سے تحریر فرمائیں کہ حضرت معاویہؓ نے حکم دیا کہ مالِ غنیمت میں سے چاندی سونا ان کے لیے الگ نکال لیا جائے۔ میرا جواب پھر وہی ہے کہ اگر فقط اسی ایک کتاب کا حوالہ ہوتا تو ایسا تحریر کرنا بلاشبہ جائز نہ تھا، لیکن دوسری چاروں کتابوں میں اگر وہی بات درج ہے جو مولانا نے لکھی ہے تو اعتبار و لحاظ غالب مؤرخین کے قول کا ہوگا، اور مولانا نے جو کچھ لکھا ہے وہ بالکل جائز و صحیح ہے۔ پہلے "البلاغ" میں چاروں حوالوں کو بالکل ساقط اور نظر انداز کر دیا گیا تھا لیکن میری نشان دہی پر اب مجبوراً یہ تسلیم کرنا پڑا ہے کہ "یہ درست ہے کہ باقی چار حوالوں میں بیت المال کا لفظ نہیں ہے۔" لیکن پھر بھی مدیر البلاغ فرماتے ہیں کہ کیا میں نے البدایہ کا حوالہ نقل کر کے کسی جرمِ عظیم کا ارتکاب کیا ہے۔ میں عرض کرتا ہوں کہ آپ نے ہرگز کسی جرم کا ارتکاب نہیں فرمایا اور نہ کسی نے ایسا کہا ہے۔ میں نے تو صرف یہ لکھا تھا کہ "جناب محمد تقی صاحب نے کیا یہ ہے کہ باقی کتابوں کو چھوڑ کر صرف البدایہ کا حوالہ نقل کر دیا۔" اب جناب موصوف مجھے صرف یہ سمجھا دیں کہ جب آپ ایک کتاب کا حوالہ دے کر اور بقیہ کو چھوڑ کر ایک بات لکھنے

میں مجرم نہیں ہیں تو مولانا مودودی چار کتابوں پر انحصار کرتے ہوئے ایک بات لکھ دینے سے کیسے مجرم بن گئے ؟ یہ جُرمِ عظیم والا الزام آپ خواہ مخواہ بیچ میں لارہے ہیں ورنہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ صرف یہ ہے کہ صرفِ خاص اور بیت المال کے حدود و امتیازات اُس زمانے میں واضح نہیں رہے تھے، اسی لیے مؤرخین کہیں لنفسہٖ اور کہیں لبیت المال لکھ دیتے ہیں۔ جہاں تک اس خاص واقعۂ مذکورہ کا تعلق ہے تو اس میں اکثر و بیشتر مصنفین نے بیت المال کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ تاریخ الکامل کے علاوہ ابن الاثیرؒ نے اُسد الغابہ میں جہاں حضرت حکمؓ بن عمرو کے حالات بیان کیے ہیں انہوں نے وہاں بھی یہی لکھا ہے۔ فرماتے ہیں :

کتب الیہ زیاد ان امیرالمومنین	زیاد نے حضرت حکمؓ کو لکھا کہ امیرالمومنین معاویہؓ نے
یعنی معاویۃ کتب ان یصطفی لہ الصفراء	تحریر فرمایا ہے کہ ان کے لیے سونا اور چاندی الگ کر لیا
والبیضاء فلا تقسم فی الناس ذھب ولا فضۃ	جائے اور لوگوں میں اسے تقسیم نہ کیا جائے ۔

امام حاکمؒ نے المستدرک ج ۳، ص ۴۴۲ میں اس واقعہ کے متعلق جو روایت دی ہے، اس میں بھی لبیت المال کا لفظ نہیں، بلکہ صرف لہٗ کا لفظ ہے۔ امام ذہبیؒ کی تلخیص میں بھی روایت اسی طرح درج ہے۔

میں اب اس ناگوار بحث کو پھیلانا نہیں چاہتا ورنہ میں یہ چیز بھی وضاحت کے ساتھ بیان کرتا کہ خلافتِ راشدہ کے بعد دوسرے خلفاء نے اپنے ذاتی بیت المال بھی قائم کر رکھے تھے جن میں خمس، فے وغیرہ کے اموال داخل کر دیتے جاتے تھے۔ یہ نجی بیت المال سرکاری بیت المال کے علاوہ تھے، گویا کہ ایک مسلمانوں کا عام بیت المال ہوتا تھا اور دوسرا امیرالمومنین کا نجی اور خاص بیت المال ہوتا تھا۔ چنانچہ اسی البدایہ، ج ۸، ص ۲۹ پر تو لبیت المال کے الفاظ ہیں (جن کی مدد سے عثمانی صاحب مولانا مودودی کی تغلیط کر رہے ہیں) لیکن اسی کتاب کی اسی جلد میں ذرا آگے ص ۴۷ پر ابن کثیر اسی واقعہ کو دوبارہ بیان کرتے ہوئے لبیت المال کے بجائے لبیت مال اللہ کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں :

جاء کتاب زیاد الیہ علی لسان معاویۃ	حضرت حکمؓ کے پاس حضرت معاویہؓ کا خط زیاد کی طرف
ان یصطفی من الغنیمۃ لمعاویۃ ما فیھا من	سے آیا کہ وہ غنیمت میں سے امیر معاویہؓ کے لیے سونا
الذھب والفضۃ لبیت مال اللہ فرد علیہ :	چاندی الگ کر لیں جو حضرت معاویہؓ کے بیت المال

ان کتاب اللہ قبل کتاب امیر المومنین ادلم یسمع لقولہ علیہ السلام: لا طاعۃ لمخلوق فی معصیۃ اللہ وقسم فی الناس غنا ئمھم فیقال انہ حُبس الی ان مات

کے لیے ہوگا۔ حضرت حکمؓ نے جواب دیا کہ اللہ کی کتاب امیر المومنین کے مکتوب پر مقدم ہے۔ کیا انہوں نے نہیں سنا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت جائز نہیں پھر حضرت حکمؓ نے سارا مالِ غنیمت مجاہدین میں تقسیم کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ انہیں قید کر دیا گیا حتیٰ کہ ان کی وفات ہوگئی۔

اب میں پوچھتا ہوں کہ دوسرے سارے مؤرخین اگر بیت المال کا لفظ سرے سے استعمال ہی نہیں کرتے اور ابن کثیر ایک جگہ اگر کرتے ہیں تو چند صفحوں کے بعد ہی وہ لبیت مالہ کے ساتھ اس کی توضیح کر دیتے ہیں اور یہ بھی معلوم ہے کہ بنو امیہ کے صرفِ خاص کے لیے بھی "امیر المومنین کا بیت المال" کی اصطلاح مستعمل تھی اور یہ مسلمانوں کے بیت المال سے زاید ایک شئے تھی تو پھر مولانا مودودی کے تحریر کردہ الفاظ کس قاعدے اور کس اعتبار سے قابلِ اعتراض ہوسکتے ہیں؟ افسوس کہ معترض حضرات بار بار ان مسائل کو چھیڑ کر ہر بار مجھے وہ باتیں کھول کر کہنے پر مجبور کر رہے ہیں جو میں نہیں کہنا چاہتا تھا۔

اخبارات کی غلط مثال | "خلافت و ملوکیت" میں جو بات چار کتابوں کے حوالے سے درج کی گئی تھی اور جس کے لیے میں دو تین مزید حوالے پیش کر چکا ہوں، اسے "دو اور دو چار" کی طرح غلط ثابت کرنے کے لیے مولانا محمد تقی صاحب نے ایک اور مثال وضع کی ہے۔ فرماتے ہیں "اگر چار اخباروں میں یہ خبر شائع ہو کہ مولانا مودودی نے اپنے لیے ایک لاکھ روپیہ چندہ وصول کیا اور ایک پانچویں اخبار میں یہ ہو کہ مولانا مودودی صاحب نے جماعت اسلامی کے لیے ایک لاکھ روپیہ چندہ وصول کیا۔ پھر کوئی شخص ان پانچوں اخباروں کے حوالے سے مولانا پر یہ الزام عائد کرے کہ وہ اپنی ذات کے لیے چندہ وصول کرتے ہیں تو کیا ملک صاحب اس الزام تراش شخص کو پانچواں اخبار محض اس لیے نہیں دکھائیں گے کہ اس کا حوالہ پانچویں نمبر پر سب سے آخر میں دیا گیا تھا" اب مولانا مودودی پر الزام تراشی کا الزام جڑنے کے لیے جو یہ مثال گھڑی گئی ہے اس کے متعدد پہلو قابلِ غور ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اخبارات اور تاریخ اور حدیث و آثار کی کتابوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ ایک اخبار کسی ایک شخص کی تصنیف نہیں ہوتا، اس کی مختلف خبروں کی آئے دن تردید ہوتی رہتی ہے بلکہ اس میں ایسا مواد بھی چھپتا رہتا

ہے جس کی پیشانی پر یہ درج ہوتا ہے کہ "اس سے ادارہ تحریر کا متفق ہونا ضروری نہیں"۔ اس کے برعکس تاریخ و روایات پر مشتمل تصنیف ایک ہی شخص کی کاوشِ قلم کا نتیجہ ہوتی ہے اور مصنف اس کے مواد میں ہر روز ترمیم و تصحیح نہیں کرتا رہتا۔

پھر اگر اس مثال کو مولانا مودودی پر چسپاں کرنا ہی ہے تو صحیح مثال یُوں ہو گی کہ ایک اخبار ابن سعدؒ کی ادارت میں ۲۳۰ھ میں شائع ہوا جس میں یہ خبر چھپی کہ مولانا مودودی نے ایک لاکھ چندے کا اپنے لیے مطالبہ کیا۔ پھر دوسرے اخبار میں یہی خبر انہی الفاظ کے ساتھ ۳۱۰ھ میں چھپی اور اس اخبار کے مدیر امام ابن جریر تھے۔ پھر امام حاکم نے ۴۰۵ھ میں یہی خبر اپنے اخبار میں شائع کی۔ اس کے بعد ابن اثیر نے ایک اخبار ۶۳۰ھ میں نکالا اور اس میں یہ خبر بعینہ انہی الفاظ میں چھاپی۔ پھر امام ذہبیؒ کے زیرِ ادارت ایک اخبار ۷۴۸ھ میں اشاعت پذیر ہوا اور اس میں بھی یہی خبر چھپی کہ مولانا مودودی نے ایک لاکھ روپیہ اپنے لیے طلب کیا۔ اس کے بعد سب سے آخر میں ابن کثیرؒ نے اپنا اخبار ۷۷۴ھ میں جاری کیا اور اس میں یہ خبر شائع کی کہ مولانا مودودی نے ایک لاکھ روپیہ چندہ بیت المال کے لیے طلب کیا اور چند روز بعد ابن کثیر نے اسی اخبار میں یہی خبر اس طرح چھاپی کہ مولانا نے یہ چندہ اپنے بیت المال کے لیے مانگا۔ اب یہ سارے اخبارات اگر ایک ہی زمانے میں نکلے ہوتے، تب تو بات دوسری تھی لیکن ان میں سے ہر ایک کے درمیان اگر ایک ایک صدی یا اس سے زائد کا فصل حائل ہو تو قدیم اخبارات کی رپورٹ ہی قابلِ اعتماد ہو گی اور اس رپورٹ کو ایک شخص اصل الفاظ میں دُہرا دے تو وہ الزام تراشی کا مجرم ہرگز نہ ہو گا اور نہ وہ سارے اخبار نویس الزام تراش قرار پائیں گے جو سات سو سال تک یہ خبر دیتے چلے آئے ہیں، بالخصوص جبکہ مؤخر ترین اخبار نویس کا ذریعۂ معلومات بھی پُرانے اخبار ہی ہوں اور دونوں کی خبر میں حقیقی نہیں، بلکہ محض لفظی تفاوت ہو۔

اپنی تردید آپ | پھر یہ بھی ایک پُرلطف حقیقت ہے کہ الزام تراشی کا جو الزام مدیر البلاغ نے اس زورشور سے مولانا مودودی پر عائد کیا ہے اور جسے ثابت کرنے کے لیے اتنی جدوجہد کی ہے، آگے چل کر خود ہی اس کا ابطال بھی فراہم کر دیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

"یوں ملک صاحب کے مزید اطمینان کے لیے ہم یہ وثوق کے ساتھ عرض کر سکتے ہیں کہ ساتویں صدی تک کے لوگوں نے بھی ان الفاظ (لہ بالنفسہ) کا یہی مطلب لیا ہو گا

کہ حضرت معاویہؓ نے یہ مال اپنی ذات کے لیے نہیں بلکہ بیت المال کے لیے منگایا تھا۔ اس لیے کہ وہ لوگ زبان و بیان کے محاورات سے اتنے بے خبر نہیں تھے کہ الفاظ کے ظاہری کو تھام کر بیٹھ جائیں اور اس بات سے قطع نظر کرلیں کہ اگر ایک امیرِ سلطنت اپنے کسی ماتحت کو یہ حکم لکھ کر بھیجے کہ خراج کا روپیہ مجھے بھیج دو تو محاورۃً "مجھے" سے مراد اپنی ذات نہیں ہوتی، بلکہ سرکاری خزانہ ہوتا ہے۔"

چلیے، قصہ کوتاہ گشت ورنہ دردِ سر بسیار بود۔ مولانا عثمانی صاحب نے آخرکار خود ہی یہ نکتہ ارشاد فرما دیا کہ ساتویں صدی تک کے لوگوں نے بھی یہی سمجھا ہوگا کہ حضرت معاویہؓ نے یہ مال اپنی ذات کے لیے نہیں منگایا تھا اور ساتویں صدی میں آکر ابن کثیرؒ نے اس حقیقت کو مزید واشگاف کر دیا کہ لَہٗ کا مطلب لبیت المال ہی ہے۔ تو پھر مولانا مودودی نے جو یہ لکھ دیا کہ "حضرت معاویہؓ نے حکم دیا کہ مالِ غنیمت میں سے چاندی سونا ان کے لیے الگ نکال دیا جائے"۔ آپ اس سے یہی مطلب اخذ و متعین فرما لیجیے کہ "ان کے لیے" سے مراد "بیت المال کے لیے" ہے۔ پھر آپ کی اس لمبی چوڑی الزامی بحث کی تو کوئی اصلیت باقی نہ رہی کہ مولانا مودودی نے ابن کثیر کا حوالہ دینے کے باوجود ان کی طرف غلط بات منسوب کی ہے اور امیر معاویہ پر "خیانت" اور اپنی ذات کے لیے مالِ غنیمت حاصل کرنے کی تہمت عائد کی ہے۔ آپ کے بقول "لوگ زبان کے محاورات سے اتنے بے خبر نہیں کہ انہیں یہ تک معلوم نہ ہو کہ "مجھے" سے مراد اپنی ذات نہیں ہوتی۔ بلکہ سرکاری خزانہ ہوتا ہے اور وہ لوگ "مجھے" کے لفظ کو پکڑ کر بیٹھ جائیں۔" پھر آخر آپ ہی اس محاورے سے کیوں اتنے بے خبر ہیں کہ مولانا مودودی کے لفظ "ان کے لیے" کو پکڑ کر بیٹھ گئے ہیں اور اس رائی کو برابر گھس گھس کر اس میں سے پربت برآمد کرنے کی کوشش کیے چلے جا رہے ہیں؟ اگر آپ کے نزدیک محاورۃً "مجھے" سے مراد اپنی ذات نہیں ہوتی، بلکہ سرکاری خزانہ ہی ہوتا ہے" تو پھر آپ کے اس اعتراض کی تو پوری بنیاد ہی منہدم ہوگئی کہ "ابن کثیر صاف لکھ رہے ہیں کہ سارا سونا چاندی بیت المال کے لیے جمع کیا جائے۔ مگر مولانا مودودی اس عبارت کے حوالے سے یہ تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت معاویہؓ نے حکم دیا کہ سونا چاندی ان کے لیے الگ نکال لیا جائے"۔ مدیر البلاغ نے یہ اعتراض وارد کرنے کے بعد لکھا تھا کہ ہمارا ناطقہ قطعی طور پر سربگریباں ہے کہ اس تفاوت کی کیا تاویل کیا توجیہ کریں؟ جواباً عرض ہے کہ آپ سرِ ناطقہ کو گریباں سے نکالیں اور "وہ بیت المال کے لیے" اور

"ان کے لیے" میں جو لفظی تفاوت ہے اس کی وہی تاویل و توجیہ کریں جو آپ نے خود ہی اختیار فرمائی ہے اور جسے میں ابھی نقل کر چکا ہوں کہ محاورۃً "ان کے لیے" سے مراد اپنی ذات نہیں بلکہ سرکاری خزانہ ہوتا ہے" سونا چاندی بیت المال کے لیے خاص کرنا | اب اس کے بعد البتہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر مالِ غنیمت کا سونا چاندی بیت المال کے لیے مقصود تھا، تو پھر اس فعل پر اعتراض کس حیثیت سے ہے۔ اس سوال کا جواب بھی میری طرف سے ربیع الآخر ۸۹ھ کے ترجمان میں دیا جا چکا ہے۔ میں نے لکھا تھا کہ:

"اگر یہی مان لیا جائے کہ یہ حکم بیت المال کے لیے تھا، پھر بھی یہ قرآن و سنت کے خلاف ہے۔ قرآن مجید میں کل مالِ غنیمت کا پانچواں حصّہ بیت المال کے لیے لینے کا حکم دیا گیا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے عہدِ مبارک سے لے کر خلفائے راشدین کے آخری زمانے تک اسی پر عمل ہوتا رہا ہے۔ اس امر کی کوئی نظیر نہیں ملتی کہ سونا اور چاندی مالِ غنیمت سے الگ نکال کر بیت المال میں داخل کر دیا گیا ہو اور قرآن مجید کے الفاظ میں بھی اس تخصیص کے لیے کوئی گنجائش نہیں پائی جاتی۔"

میری اس بات کا رد جتنی بھی احتمال آفرینیوں سے ممکن ہے، وہ مدیر البلاغ اپنی سابق بحث ہی میں پیش کر چکے ہیں اور میں نے ان میں سے ہر ایک کا ابطال بھی کر دیا تھا۔ کوئی صاحب چاہیں تو پُرانے البلاغ اور ترجمان کو آمنے سامنے رکھ کر دیکھ لیں اور پھر تازہ البلاغ کو بھی پڑھ کر خود ہی فیصلہ کر لیں کہ کس کی بات میں وزن ہے یا نہیں ہے۔ ہر بات کو دُہرانا تو ممکن نہیں ہے، تاہم مثال کے طور پر میں ان کا یہ تازہ قول نقل کرتا ہوں کہ "اگر سونا چاندی پُورے مالِ غنیمت کا پانچواں حصّہ ہو تو یہ حکم شریعت کے مطابق ہو جاتا ہے۔ بیت المال میں سونے چاندی کی کمی ہو گی اس لیے حضرت معاویہؓ نے یہ حکم دیا۔"
میری گزارش یہ ہے کہ اس مفروضے کی آخر کوئی بنیاد تو ہونی چاہیے کہ یہ سونا چاندی بلاکم و کاست کل غنیمت کا ⅕ تھا اور بیت المال میں سونے چاندی کی کمی تھی اگر فی الواقع ایسا تھا تو حضرت معاویہؓ نے اس کی تصریح فرما دی ہوتی کہ یہ سونا چاندی جملہ غنائم کی قیمت کا عین ⅕ ہے ایسا اندازہ کر لینا گو کہ محال ہے، تاہم اگر ایسا صحیح اندازہ زیاد اور امیر معاویہؓ کے لیے ممکن تھا تو مجاہدین اور ان کے سپہ سالار حضرت حکم بن عمروؓ کے لیے کیوں ناممکن تھا؟

کیوں حضرت حکمؓ نے اس پر شدید انکار و احتجاج کیا جو ان کے لیے جان لیوا ثابت ہوا؟ اور کیوں اس پر سارے لشکری خاموش رہے؟ آخر دونوں طرف دو صحابی رسول ہیں اور ہو سکتا ہے کہ فوج میں مزید صحابہ کرام بھی ہوں۔ ایک صحابی (حضرت معاویہؓ) جو میدانِ جنگ سے دُور بیٹھے ہیں ان کا اندازہ تو آپ کے نزدیک بالکل صحیح ہے لیکن دوسرے صحابی جو شریک جہاد ہیں اور جو اس حکم کے خلاف آواز بلند کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کتاب اللہ کتاب امیر المومنین سے زیادہ واجب التعمیل ہے، آپ انہیں گویا کہ دُہرا خطاوار ٹھہراتے ہیں کہ انہوں نے احکام شرعی کے بھی خلاف کیا اور امیر المومنین کی بھی نافرمانی کی :

کیا احترام صحابہ کرام کا مطلب آپ کے نزدیک فقط یہ ہے کہ امیر معاویہؓ کی تو ہر بات کی تائید و تصویب کی جائے خواہ کتاب و سنت میں اس کے حق میں کوئی دلیل نہ ہو اور جو صحابی امیر معاویہؓ سے اختلاف کریں ان کے موقف کی تغلیط ہی کی جائے خواہ وہ کتاب و سنت کے موافق ہی ہو؟ اگر آپ نے حضرت معاویہؓ کے ہر قول و فعل کو جائز و ثابت کرنے کی قسم کھا رکھی ہے تو آپ کو صرف "خلافت و ملوکیت" اور تاریخی کتابوں ہی کی تردید و تنقید پر اکتفا نہیں کرنا ہوگا بلکہ حدیث کی صحیح ترین کتب کے بعض اجزاء پر خطِ تنسیخ کھینچنا پڑے گا۔ مثال کے طور پر صحاح ستہ کی تقریباً سب کتابوں میں اور موطا امام مالک اور مسند احمد میں ایسی روایات موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ امیر معاویہؓ نے بیع و شراء کے ایسے معاملات کیے تھے۔ جن پر حضرت عبادہؓ بن صامت نے حضرت معاویہؓ کے سامنے ارشاداتِ نبویؐ پیش کر کے انہیں ٹوکا، تب بھی آپ نے غلطی کو تسلیم نہ کیا۔ اسی طرح کا واقعہ حضرت ابوالدرداءؓ کا مروی ہے جس کی بنا پر انہیں شام کی سرزمین چھوڑنی پڑی۔ محدثین و شارحین نے ان احادیث کی تشریح کرتے ہوئے امیر معاویہؓ پر نہایت سخت الفاظ میں تنقید کی ہے۔ یہ پوری تفصیل میں آگے چل کر کہیں نقل بھی کر دوں گا۔ کیا یہ سارے محدثین و مفسرین حضرت معاویہؓ اور صحابہ کرام کی منقبت و منزلت سے بالکل بے بہرہ اور جاہل تھے اور اب مدیر البلاغ ہی ایک ایسے فرد فرید کہیں سے ہویدا ہو گئے ہیں جو ہمیں تعظیم و تکریم صحابہ کا سبق سکھانے لگے ہیں؟

حقیقت یہ ہے کہ یہ دعویٰ اور یہ تاویل بالکل بے بنیاد ہے کہ امیر معاویہؓ نے جو سارا سونا چاندی طلب فرمایا تھا، وہ مالِ غنیمت کا ⅕ تھا۔ ہر جنس اور ہر مال کا پانچواں حصہ اگر الگ کر دیا جاتا

اور سونے چاندی کا بھی صرف پانچواں حصہ بطور خمس الگ کر لیا جاتا تب تو اس کا مطالبہ معروف قاعدے کے مطابق جائز ہوتا لیکن یہ دعویٰ کہ کل سونا چاندی کل غنائم کا ۱/۵ تھا۔ یہ اس وقت تک ثابت نہیں ہو سکتا تھا جب تک کہ پورے اموالِ غنیمت کی مالیت ایک طرف اور سونے چاندی کی مالیت دوسری طرف متشخص کی جاتی۔ اور پھر یہ معلوم ہوتا کہ سونے چاندی کی قیمت جملہ اموال کی قیمت کا پانچواں حصہ بنتی ہے۔ مدیر البلاغ اس احتمال کو بھی بار بار دہرا رہے ہیں کہ اس وقت بیت المال میں سونے چاندی کی کمی تھی جسے امیر معاویہؓ پورا کرنا چاہتے تھے اور میں جب اس احتمال کو نہیں تسلیم کرتا تو فرماتے ہیں کہ "یہ مقام تو ہمارے محترم نقاد ہی کو حاصل ہے کہ وہ چودہ سو سال پہلے کی حکومت کے بارے میں اُس وقت کے حکمران سے بھی زیادہ صحیح اندازہ لگا لیتے ہیں کہ اس وقت بیت المال میں سونے چاندی کی ضرورت تھی یا نہیں ہمیں کشف و الہام کا یہ کمال تو حاصل نہیں لیکن جو تھوڑی سی عقل اللہ نے دی ہے، اس سے اتنا خیال ضرور ہوتا ہے کہ اس زمانے میں دو دھاتی معیار پر مبنی نظامِ زر رائج تھا جس میں سونے چاندی کی ضرورت سب سے زیادہ ہوتی ہے۔"
مجھے کشف و الہام اور عقل و خرد میں کامل تو کیا ناقص ہونے کا دعویٰ بھی نہیں ہے، لیکن اتنی بات تو میں بھی جانتا ہوں کہ یہ دو دھاتی نظام نہ صرف حضرت معاویہؓ ہی کے عہد میں نہیں بلکہ عہدِ نبوت اور عہدِ خلافتِ راشدہ میں بھی موجود تھا اور اس زمانے میں بھی درہم و دینار اور مثقال ہی رائج تھے اس لیے اس عہدِ سعادت میں بھی سونے چاندی کی ضرورت عہدِ مابعد سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہ ہوتی ہوگی۔ پھر کیا اس بات کا کوئی ثبوت مل سکتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم یا خلفائے راشدین نے بھی کبھی مالِ غنیمت کا سونا چاندی الگ چھانٹ لیا ہو اور مجاہدین کو اس سے کلیتہً محروم کر دیا ہو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تو بعض اوقات مجاہدین کو درہم و دینار کا اتنا ڈھیر عطا فرماتے تھے ان کے لیے اٹھانا محال ہو جاتا تھا

بیت المال میں ناروا تصرف | عہدِ نبوی و خلفائے راشدین اور اس کے عین بعد کے نظامِ محاصل و مالیات کا جہاں تک میں نے مطالعہ کیا ہے، مجھے مولانا مودودی کی یہ بات بالکل بجا اور برحق دکھائی دیتی ہے کہ دورِ ملوکیت میں بیت المال کی حیثیت و تصور میں بڑی دُور رس تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ اس حقیقت سے کسی طرح انکار ممکن ہی نہیں ہے حضرت معاویہؓ کے متعلق ابن کثیرؒ (البدایہ جلد ۸، ص ۱۲۴) اور دوسرے مؤرخین کی یہ تصریح ملتی ہے کہ جب وہ عہدِ فاروقی میں عامل تھے تو آپ کا ماہانہ معاوضہ ۸۰ دینار تھا جو زیادہ سے زیادہ ایک ہزار درہم بنتے ہوں گے۔ پھر آپ کے پاس وہ لاکھوں درہم کہاں سے آتے جو آپ نے اپنے صاحب زادے کی ولی عہدی کے لیے دوسروں کے سامنے پیش کیے؟ حضرت علیؓ نے جب آپ کو شام کی گورنری سے معزول کیا تو آپ نے اس کی تعمیل سے انکار کیا۔ حضرت علیؓ کا یہ

حکم اگر نامناسب تھا یا وہ قصاصِ عثمانؓ کے معاملے میں مذبذب تھے اور امیر معاویہؓ کے لیے قصاص کا مطالبہ کر اُٹھنا ضروری یا جائز تھا تو معزول نہ سہی، انہیں از خود احتجاجاً گورنری سے مستعفی ہو جانا چاہیے تھا۔ اس عہدے پر فائز رہنا اور پورے شام کے بیت المال پر متصرف ہو کر اُسے خلیفۂ راشد کے مقابلے میں استعمال کرنا کس اصول سے صحیح ہو سکتا ہے؟ استعفاء کے بعد البتہ ایک اسلامی ریاست کے شہری یا حضرت عثمانؓ کے ولی کے طور پر اگر حضرت معاویہؓ مطالبۂ قصاص کرتے، تب بھی یہ مطالبہ کسی حد تک درست ہو سکتا تھا۔

امیر معاویہؓ کے خلیفہ بننے کے بعد بھی آپ نے اور آپ کے عہدیداروں نے بیت المال کے معاملے میں وہ احتیاط ملحوظ نہیں رکھی، جو آپ کے پیشروؤں نے رکھی تھی۔ چنانچہ امیر معاویہؓ کے گورنر مروان کے متعلق سُنن ابی داؤد، کتاب الخراج اور کتبِ تاریخ میں تصریح موجود ہے کہ اس نے فدک کو اپنی ذاتی جاگیر بنا لیا تھا، حتیٰ کہ یہ عمر بن عبدالعزیزؒ کو وراثت میں ملی تو انہوں نے اسے سرکاری اراضی میں واپس داخل کیا۔ اسی مروان کے متعلق امام ابو عُبیدؒ اپنی کتاب الاموال غنیمت و فئے کے ابواب کے ایک مقام پر حضرت عُروہ کی روایت پوری سند کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ "ایک روز مروان نے منبر پر کھڑے ہو کر کہا کہ امیر المومنین معاویہؓ نے تمہیں بھرپور عطیات دینے کا حکم فرمایا ہے اور پوری کوشش کی ہے مگر مال میں سے ایک لاکھ درہم کم ہے اور انہوں نے مجھے لکھا ہے کہ یمن کی زکوٰۃ جب یہاں سے گزرے تو میں اُس میں سے یہ مال (تمہارے لیے) لے لوں۔ حضرت عروہ کہتے ہیں کہ لوگ گھٹنوں کے بل کھڑے ہو گئے اور میں نے انہیں یہ پکارتے ہوئے سنا "ہرگز نہیں، ہم ان میں سے ایک درہم بھی نہیں لیں گے کیا ہم دوسروں کا حق وصول کر لیں؟ یہ مال تو یتامیٰ و مساکین کے لیے صدقہ ہے۔ ہمارے عطیات تو خزینے میں سے ملنے چاہییں۔ تم معاویہؓ کو لکھو کہ وہ ہمیں بقیہ عطایا بھیج دیں"۔ حضرت عُروہ فرماتے ہیں کہ "مروان نے یہ بات لکھی، تب امیر معاویہؓ نے بقایا ارسال فرمایا"

(کتاب الاموال، ص ۲۵۹، روایت ۶۳۵، مکتبہ ظاہریہ، دمشق، ۱۳۴۸ھ)

حافظ ابو عبید القاسم بن سلام جن کی وفات ۲۲۴ھ میں ہوئی ہے، ایک نہایت صاحب تحقیق محدث ہیں اور ان کی کتاب الاموال اسلامی محارج و محاصل پر ایک مستند دستاویز شمار ہوتی ہے۔ ان کا بیان کردہ واقعہ یہ ظاہر کر رہا ہے کہ لوگوں نے بروقت انکار و احتجاج نہ کیا ہوتا تو مساکین کی حق تلفی ہو جاتی اور زکوٰۃ کا مال غلط مصرف میں صرف ہو جاتا۔

استلحاقِ زیاد

مالِ غنیمت والے معاملے پر سیرحاصل بحث کے بعد اب میں استلحاقِ زیاد کا مسئلہ لیتا ہوں میں نے اپنے سابق سلسلہ مضامین میں محتاط طریقے پر مفصل بحث کر دی تھی اور میرا گمان یہ تھا کہ کم از کم اس موضوع پر محمد تقی عثمانی صاحب سکوت اختیار کریں گے کیونکہ یہ ایک ناگفتنی سا مسئلہ ہے جو زیادہ ردّ و کد کے لیے موزوں نہیں ہے اور اس میں حضرت معاویہؓ نے جو کچھ کیا ہے۔ اس کے لیے اخلاقی و قانونی دفاع فراہم کرنا ممکن نہیں ہے لیکن مجھے سخت حیرت و تاسف ہے کہ عثمانی صاحب نے اس کا جواز مہیا کرنے کی دوبارہ کوشش فرمائی ہے اور مجھے دوبارہ مجبور کیا ہے کہ اس پر کلام کروں۔ آپ البلاغ میں لکھتے ہیں:

"میں نے ابن خلدون وغیرہ کے حوالے سے یہ ثابت کیا تھا کہ زمانۂ جاہلیت میں سمیّہ کے ساتھ حضرت ابوسفیان کے جس تعلق کو مولانا مودودی صاحب نے زنا کا عنوان دیا ہے، وہ درحقیقت جاہلی نوعیت کا ایک نکاح تھا اور اس نوعیت کا نکاح اگرچہ اسلام کے بعد منسوخ ہو گیا لیکن اس قسم کے نکاح سے جو اولاد جاہلیت میں پیدا ہوئی اسے ثابت النسب کہا گیا۔ زیاد کا معاملہ بھی یہی تھا۔"

نکاحِ ابوسفیان؟ ابنِ خلدون کے ساتھ وغیرہ کا لفظ تو محض تکلف ہے، مولانا محمد تقی صاحب کا اصل انحصار پہلے اور اب بھی ابن خلدون کی ایک عبارت پر ہے۔ ابن خلدون نے جو کچھ لکھا ہے اور مدیر البلاغ نے جو کچھ ثابت کیا تھا، وہ ایک بڑی عجیب و غریب یا پھر بڑی گہری اور عمیق شے ہے، اس لیے میں اسے دوبارہ نقل کیے دیتا ہوں۔ ابنِ خلدون کا ترجمہ عثمانی صاحب نے ان الفاظ میں کیا تھا:

"سمیّہ جو زیاد کی ماں ہے، حارث بن کندہ طبیب کی لونڈی تھی اسی کے پاس اس سے حضرت ابوبکرہ پیدا ہوئے۔ پھر اس نے اس کی شادی ایک آزاد کردہ غلام سے کر دی تھی اور اس کے یہاں زیاد پیدا ہوا۔ ابوسفیان اپنے کسی کام سے طائف گئے ہوئے تھے۔ وہاں انھوں نے سمیّہ سے اس طرح کا نکاح کیا جس طرح کے نکاح جاہلیت میں رائج تھے اور اس سے مباشرت کی اور اسی مباشرت سے زیاد پیدا ہوا۔"

میں نے اس پر درج ذیل گزارش کی تھی:۔

"مولانا عثمانی صاحب نے یہ عبارت تو پوری بلا تامل نقل کر دی مگر انھوں نے اس پر غور نہ کیا کہ اس میں ایک طرف تو یہ بیان کیا گیا ہے کہ سُمیّہ کی شادی غلام سے ہوئی اور اسی غلام کے ہاں زیاد پیدا ہوا اور دوسری طرف یہ بھی بیان ہے کہ سمیّہ کا نکاح ابوسفیان سے ہوا جس سے زیاد پیدا ہوا۔ ان دو باتوں میں سے آخر کون سی درست ہے؟ یا دونوں درست ہیں اور دو نکاحوں کے نتیجے میں زیاد نے دو مرتبہ جنم لیا؟ یا ایک نکاح اور ولادت تو علانیہ تھی اور دوسری ولادت دوسرے نکاح کے مانند خفیہ تھی۔ اس معمّہ کو عثمانی صاحب ہی حل کر سکتے ہیں!"

افسوس کہ اس دلچسپ معمّے کا حل ابھی تک البلاغ میں شائع نہ ہوا۔ اب ترجمان اور البلاغ کے قارئین سے میری درخواست ہے کہ ان میں سے کوئی صاحب اس پہیلی کو بوجھ سکتے ہوں تو مجھے آگاہ فرمائیں اور میری جانب سے ہدیۂ تشکر وصول کریں۔ حضرت ابوسفیان اور زیاد کی والدہ کے تعلق کو نکاح ثابت کرنے میں مدیر البلاغ کتنی ہی سعی کیوں نہ صرف کریں، فی الحقیقت اس پر جاہلیت کے نکاحوں میں سے کسی نکاح کا اطلاق بھی نہیں ہو سکتا۔ جناب محمد تقی صاحب نے بخاری کے حوالے سے نکاح کی جن اقسام کا ذکر کیا ہے، مَیں نے ان کی تفصیل بتا کر ثابت کر دیا تھا کہ ان کے ذریعے سے نسب کا تقرر و تعین بچے کی ولادت کے فوراً بعد ہو جاتا تھا۔ لیکن اس کے جواب میں عثمانی صاحب پھر لکھتے ہیں کہ "غلام علی صاحب نے اس بات کی کوئی دلیل نہیں دی کہ جاہلیت کے انتساب میں اعلانِ عام ایک لازمی شرط کی حیثیت رکھتا تھا۔" اس مطالبۂ دلیل کی حقیقت اور وزن معلوم کرنے کے لیے میں اپنے پہلے مضمون کا ایک ضروری ٹکڑا دوبارہ نقل کرتا ہوں، مَیں نے لکھا تھا:

"جاہلیت کے یہ نام نہاد نکاح جیسے کچھ بھی تھے، ان سے متعلق ایک بات بہرحال واضح و ثابت ہے اور وہ یہ کہ ان کے نتیجے میں جو بچہ بھی پیدا ہوتا تھا، اس کا نسب بہرحال ایک فردِ متعین سے ولادت کے معاً بعد ملحق ہو جاتا تھا اور اس کے الحاق کا بھی متعین ضابطہ اور طریقہ مقرر تھا۔ اس میں فیصلہ کن چیز عورت کا یا قیافہ شناس کا بیان تھا جس کے بعد بچے کا باپ اسے باقاعدہ اپنا بچہ تسلیم کر لیتا تھا اور اس کا نسب ولادت ہی کے وقت معروف و مسلّم ہو جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ نسب و انتساب کی یہ صورتیں جو جاہلیت میں رائج تھیں وہ اس وقت

تک مستحق اور مسلّم شمار نہیں ہو سکتی تھیں جب تک سوسائٹی میں ان کا اعلان عام نہ ہو جائے اور مرد صُلبی اولاد کی طرح بچے کو اپنے کنبے میں داخل نہ کر لے عقلِ عام اور فطرتِ سلیم اس کی اجازت نہیں دے سکتی کہ ایک مرد ایک عورت سے خفیہ تمتع کرے، اس کے بعد جس بچے کی پیدائش ہو اسے اپنے خاندان میں داخل بھی نہ کرے، پھر جب لڑکا جوان ہو کر پر پُرزے نکالے تو وہ شخص دو چار یا پانچ دس آدمیوں سے مخفی طور پر کہہ دے کہ یہ لڑکا دراصل میرے نطفے سے ہے، پھر وہ چند اشخاص اس رازِ سربستہ کو اس شخص کی وفات کے برسوں بعد فاش کریں اور اس طرح حق بحقدار رسید ہو

جاہلیت کے نکاح یہ میرے استدلال کی تمہید ہے، ورنہ آگے میں نے پورے تین صفحات میں اپنے دلائل مفصل بیان کر دیے تھے۔ اب میری سمجھ میں نہیں آتا کہ پھر دوبارہ مجھ سے کیسی دلیل مانگی جا رہی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جاہلیت کے اس جائز یا ناجائز تعلق کی صورت خواہ خفیہ ہو یا علانیہ ہو، اس کے مولود کا نسب تو مخفی رہ ہی نہیں سکتا۔ بچہ کوئی چھپنے چھپانے والی چیز تو نہیں ہے۔ اس کے تو پیدا ہوتے ہی یہ سوال سامنے آکھڑا ہوتا ہے کہ یہ حلالی ہے یا حرامی؟ اور حلالی ہے تو اس کا باپ کون ہے؟ اگر اس کا کوئی باپ ثابت نہ ہو اور وہ اسے اپنا بچہ تسلیم نہ کرے، تو جاہلی معاشرے تک میں وہ حرامی قرار پاتا تھا۔ یہ بات صریح عقل کے خلاف ہے کہ بچے کی پیدائش کے سالہا سال بعد اس کا نسب کسی سے ثابت ہو اور وہ حلالی قرار پائے۔ جاہلیت میں زنا کی جن صورتوں کو نکاح سمجھا جاتا تھا ان میں بھی بچے کی پیدائش کے بعد کوئی نہ کوئی اس کا باپ بنتا تھا یا بنایا جاتا تھا۔ عورت خواہ منکوحہ ہوتی یا مملوکہ یا ممنوعہ، وہ خود کسی کو بچے کا باپ نامزد کرتی یا قیافہ شناس بتاتا یا پھر باپ خود اعلان کرتا کہ میں اس کا باپ ہوں۔ صحیح بخاری کی جس حدیث کا حوالہ مولانا محمد تقی صاحب نے دیا تھا، وہ باب لا نکاح الا بولی میں موجود ہے اور اس میں تصریح ہے کہ عورت اپنے سے تعلق رکھنے والے مرد کا نام بچہ پیدا ہوتے ہی لے لیتی تھی، پھر بچے کے نسب کا الحاق اُسی مرد سے ہو جاتا تھا اور وہ شخص اس کا انکار نہیں کر سکتا تھا (لا یستطیع ان یمتنع بہ الرجل)۔ اس کے بعد اسی حدیث میں اس بات کی بھی توضیح ہے کہ بغایا (طوائفوں) کے ہاں اگر بچہ ہوتا تھا تو قیافہ شناس کو بلایا جاتا تھا اور بچے کی ماں کے ہاں آمد و رفت رکھنے والوں کو بھی جمع کیا جاتا تھا۔ پھر قیافہ شناس ایک متعین شخص کو بچے کا باپ قرار دیتا تھا اور اُسی کے باپ ہونے کا دعویٰ کر دیا جاتا تھا جس سے انکار ممکن نہیں ہوتا تھا (دُعی ابنہ لا یمتنع من ذالک)۔ کیا اس کے بعد بھی نسب و انتساب کے خفیہ رہنے، مشتبہ ہونے یا اعلانِ عام نہ ہونے کا کوئی موقع باقی رہ سکتا تھا؟

اس روایت میں جو اقسامِ نکاح بیان ہوئی ہیں، مدیرِ البلاغ نے اب ان میں مزید کچھ قسموں کا اضافہ کرنے کی کوشش کی ہے اس کے حق میں وہ داؤدی کا قول نقل کرتے ہیں کہ "جاہلی نکاح کی کچھ قسمیں ایسی ہیں جو حضرت عائشہؓ نے بیان نہیں فرمائیں۔ ان میں سے پہلی قسم خفیہ آشنائی کا نکاح ہے اور اس کا ذکر قرآن کریم کے ارشاد وَلَا مُتَّخِذَاتِ أَخْدَانٍ میں موجود ہے۔ جاہلیت کے لوگ کہا کرتے تھے کہ ایسا تعلق اگر خفیہ طور پر ہو تو اس میں کچھ حرج نہیں اور علی الاعلان ہو تو وہ قابلِ ملامت ہے۔" کاش کہ ایسی واہی بات نقل کرنے سے پہلے عثمانی صاحب کچھ تو غور و تامل کر لیتے! یہ بات اتنی بے بنیاد ہے اور اس خفیہ آشنائی کو نکاح قرار دینا اتنا افسوسناک ہے کہ خود مدیرِ البلاغ کو بھی فقرے کے آخر میں نکاح کے بجائے "تعلق" کا لفظ لانا پڑا ہے، ورنہ وہ خدارا بتائیں کہ نکاح کی کوئی قسم ایسی بھی ہو سکتی ہے جو "خفیہ ہو تو اس میں حرج نہ ہو اور علی الاعلان ہو تو قابلِ ملامت ہو"۔ ابن حجرؒ نے انہیں بیان کر کے فوراً اس کی تردید بھی کر دی ہے کہ ان پر نکاح کی اصطلاح وارد نہیں ہوتی۔ نکاح کی یہ اقسام بیان کرنے کے بجائے پھر تو محمد تقی صاحب کو بس یہ کہہ دینا چاہیے کہ عربوں کے ہاں نکاح اور زنا میں سرے سے کوئی فرق ہی نہ تھا اور زنا کی ہر قسم داخلِ نکاح تھی۔ لیکن ایسا گمان خلافِ حقیقت ہے۔ قرآن میں ولا متخذات اخدان کی تفسیر میں امام ابن جریر لکھتے ہیں ولا متخذات اصدقاء علی السفاح .... الصدیق للفجور بہا سراً (اور نہ وہ چھپی آشنائی کے ذریعے سے زنا اور فسق و فجور کرنے والی ہوں)۔ آگے چل کر وَلَا مُتَّخِذِی اَخْدَانٍ کی تشریح میں فرماتے ہیں ولا منفرد ببغیۃ واحدۃ اتخذ لنفسہ صدیقۃ یفجر بہا (اور نہ وہ کسی ایک بدکار عورت کو اپنی آشنائی کے لیے مخصوص کرتے ہوں جس کے ساتھ وہ بدکاری کریں)۔ اسی طرح امام ابن جوزی اپنی تفسیر زاد المسیر میں سورۃ نساء کی آیت ولا متخذات اخدان کی تفسیر میں لکھتے ہیں کان اھل الجاھلیۃ یحرمون ما ظھر من الزنی ویستحلون ما خفی (جاہلیت میں لوگ علانیہ زنا کو حرام اور خفیہ زنا کو حلال سمجھتے تھے)۔ یہاں بھی ابن جوزی نکاح کے بجائے زنا کا لفظ استعمال کر رہے ہیں۔ بہرکیف حضرت عائشہؓ تو جاہلیت کے حالات سے داؤدی کی بہ نسبت زیادہ واقف تھیں اور انہوں نے اس قسمِ نکاح کا ذکر نہیں فرمایا۔

یہ بات کتنی رنجیدہ اور باعثِ افسوس ہے کہ مدیرِ البلاغ بغیر سوچے سمجھے بار بار اس بات کو دہرائے جا رہے ہیں کہ اگر خفیہ استلحاق جاہلیت میں قابلِ قبول نہیں تھا، تب بھی حضرت ابوسفیان نے دس آدمیوں کی موجودگی میں نسب کا اقرار کیا تھا۔ سوال یہ ہے کہ یہ نسب کا کیسا اقرار ہے جس کی اطلاع نہ بچے کی ماں

کو ہے، نہ خود امیر معاویہؓ اور خاندان کے دوسرے افراد کو ہے، نہ اس ماں شریک دوسرے بھائی (حضرت ابوبکرہؓ) کو ہے، نہ خود زیاد کو جوان ہونے تک ہے۔ دس گواہوں[1] کے ماسوا کسی کو کانوں کان اس نسب کی خبر تک نہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس کے برعکس سمیہ جس غلام عُبید کے نکاح میں تھی، استلحاق کی کارروائی سے پہلے اسی عبید سے زیاد کا نسب ثابت و مشہور ہے اور زیاد اپنے آپ کو غلام زادہ اور عُبید ہی کا بیٹا سمجھتا ہے۔ اس سارے پینتیس ۳۵ سال کے عرصہ دراز تک سب لوگ جامد و ساکت بیٹھے رہتے ہیں اور ۴۴ھ میں یکایک یہ سرّ مکنون منکشف ہوتا ہے کہ زیاد تو ابوسفیان کا صاحبزادہ، ام المومنین حضرت ام حبیبہؓ کا علاتی بھائی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا برادر نسبتی ہے۔ زیاد پہلے ہجری سال تولّد ہو گیا تھا مگر افسوس کہ کسی شخص نے تیرہ برس تک آنحضورؐ کو نہ بتایا کہ آپ کا یہ برادرِ نسبتی ہے اور چوالیس برس تک حضرت ام حبیبہؓ کو آگاہ نہ کیا کہ یہ آپ کا بھائی ہے! حضرت معاویہؓ بلاریب حضرت ام حبیبہؓ کے برادر گرامی ہیں اور انہیں بجا طور پر خال المومنین (مسلمانوں کے ماموں) کہا جاتا ہے کیونکہ حضرت ام حبیبہؓ ام المومنین ہیں لیکن اب مدیر البلاغ کو اگر زیاد ابن ابیہ کے بارے میں بھی ایسا ہی اصرار ہے کہ وہ بھی خال المومنین ہیں تو وہ بسم اللہ کریں، آئندہ اپنے خطبوں میں، اپنی تحریروں اور تقریروں میں زیاد کے ساتھ اس لقب کا اضافہ بالالتزام فرمایا کریں تاکہ جو کوتاہی یا حق تلفی اب تک ہو چکی، اس کی کچھ تو تلافی ہو!

میرے بیان کردہ دلائل و شواہد اور تلخ حقائق کا براہِ راست سامنا کرنے کے بجائے مولانا عثمانی صاحب حسبِ سابق اپنے اُسی طرزِ استدلال کی آڑ لیتے ہیں کہ زیاد کا استلحاق اگر ایسا ہی بے بنیاد ہے تو پھر ساتھ ہی یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ امت اپنے خیر القرون میں حق کے محافظوں سے یکسر خالی ہو گئی تھی، ورنہ کیا یہ بات عقل میں آسکتی ہے کہ اتنی بڑی دھاندلی کا ارتکاب ایسے دَور میں کیا جائے۔ یہ وہی استدلال ہے جو توریث، دیت، سب و شتم

[1] یہ دس آدمیوں کی گواہی کا ذکر عثمانی صاحب بار بار صرف مدائنی کے حوالے سے کر رہے ہیں لیکن عجیب بات ہے کہ ذرا آگے چل کر خصوصی نمبر ص ۸۴ پر جہاں مولانا مودودی کی نقل کردہ ایک روایت کی تردید مقصود ہے، وہاں عثمانی صاحب فرماتے ہیں کہ مدائنی "متکلم فیہ" ہیں یہاں مدائنی کا نام بھی غلط طور پر علی بن محمد کے بجائے محمد بن علی لکھ دیا ہے۔ اب قطع نظر اس کے کہ المدائنی ثقہ ہیں یا ان کی روایات میں کلام ہے، یہ آخر عدل و انصاف کی کونسی قسم ہے کہ جب آپ مدائنی کے حوالے سے بات کریں تو مدائنی اور ان کا قول مستند ہو جائے اور جب ہم اس کی روایت کہیں نقل کر دیں تو وہ ناقابل اعتماد قرار پائے ۔ جو تیری زلف میں پہنچی تو حسن کہلائی ۔ وہ تیرگی جو مرے نامۂ سیاہ میں ہے!

وغیرہ کے جملہ مباحث میں وہ کرتے چلے آرہے ہیں۔ اگر ثابت شدہ تاریخی حقائق و وقائع کے بارے میں مجرد یہ عقلی استدلال ان واقعات کو کالعدم قرار دینے کے لیے کافی ہو، تو پھر فتنۂ ارتداد، قتلِ عثمانؓ، قتلِ حسینؓ و ابن زبیرؓ، واقعۂ حرہ، ہتکِ حرمین کے متعلق جو تفاصیل تاریخ ہی میں نہیں، مستند ترین کتب حدیث و آثار میں درج ہیں ان سب پر خطِ نسخ کھینچ دینا قطعی طور پر لازم ہوگا۔ لیکن میں اس عقلی و غیر عقلی امکان و استحالہ کی بحث میں پڑے بغیر یہ کہتا ہوں کہ امتِ اسلامیہ اپنے خیر القرون ہی میں نہیں بلکہ کسی قرن اور کسی دور میں بھی حق کے محافظوں سے یکسر خالی نہیں ہوئی۔ اگر خالی ہوتی تو یہ واقعات جس دو گونہ آویزشِ حق و باطل کی تصویر کو پیش کرتے ہیں، وہ تصویر ہماری تاریخ سے غائب ہی ہوتی، خوب و ناخوب اور غلط و صحیح کی تمیز کلیتہً مٹ چکی ہوتی۔

استلحاق کے خلاف احتجاج | خیر یہ تو محض اُس منطق کا جواب تھا جس کا سہارا لے کر عثمانی صاحب یا بعض دوسرے لوگ ہر واقعہ کا انکار کر دیتے ہیں۔ جہاں تک زیر بحث مسئلۂ استلحاق کا تعلق ہے اس میں بعض صحابہ کرام نے اُسی وقت شدید احتجاج کیا تھا اور بعد میں علماء و مورخین اب تک تنقید کرتے چلے آرہے ہیں۔ اس کی خاصی تفصیل میں پہلے بیان کر چکا، لیکن محمد تقی صاحب اگر یہی چاہتے ہیں تو میں مزید کچھ تشریح کیے دیتا ہوں۔ صحیح مسلم کے آغاز ہی میں کتاب الایمان کا ایک باب ہے جس کا عنوان ہے: حال ایمان من رغب عن ابیہ و ھو یعلم (اس شخص کے ایمان کا حال جو اپنے باپ سے نسب کو تبدیل کر دے حالانکہ وہ جانتا بوجھتا ہو)۔ اس کی درج ذیل حدیث ملاحظہ ہو:

عن ابی عثمان قال لما ادُّعِیَ زیاد لقیت ابا بکرۃ فقلت له ما ھٰذا الذی صنعتم انی سمعت سعد بن ابی وقاصٍ یقول سمع اُذنای من رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم وھو یقول من ادّعی ابا فی الاسلام غیر ابیه وھو یعلم انه غیر ابیه فالجنة علیه حرام فقال ابو بکرۃ وانا سمعته من رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلّم۔

(حضرت ابو عثمانؓ روایت کرتے ہیں کہ جب زیاد کا (ابوسفیان سے استلحاق کا) دعویٰ کیا گیا تو میں حضرت ابوبکرہؓ سے ملا اور ان سے کہا کہ آپ لوگوں نے یہ کیا کارروائی کی ہے؟ میں نے حضرت سعدؓ بن ابی وقاص سے سُنا ہے، وہ کہتے تھے کہ میں نے اپنے دونوں کانوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے کہ جو شخص اسلام میں اپنے باپ کو چھوڑ کر کسی دوسرے کو باپ بنانے کا دعویٰ کرے اور اُسے معلوم ہو کہ وہ اس کا باپ نہیں تو اس پر جنت حرام ہے۔ حضرت ابوبکرہؓ نے جواب دیا کہ میں نے بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد خود

آنحضورؐ سے سنا ہے۔

یہاں یہ امر قابلِ وضاحت ہے کہ حضرت ابوبکرہؓ چونکہ زیاد کے ماں جائے بھائی تھے، اس لیے ابوعثمانؓ نے یہ خیال کیا کہ زیاد نے جو اپنا نسب جانتے بوجھتے بدلا ہے یا اس کی تبدیلی کا دعویٰ تسلیم کیا ہے، تو شاید حضرت ابوبکرہؓ بھی اس ادّعا میں شریک ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ حضرت ابوبکرہؓ اس دعوے کے شدید ترین مخالف تھے اور آپ نے مرتے دم تک زیاد سے بات تک نہیں کی۔ چنانچہ حضرت ابوعثمان کی غلط فہمی حضرت ابوبکرہؓ نے یہ کہہ کر رفع کر دی کہ میں تو خود اس استلحاق کو ناجائز سمجھتا ہوں اور میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وعید خود سُنی ہے پھر اس حدیث پر امام مسلم یا امام نووی نے جو عنوان باندھا ہے یہ بھی ثابت کر رہا ہے کہ زیاد نے دیدہ و دانستہ اپنے حقیقی باپ کے بجائے دوسرے شخص کی جانب انتساب گوارا کیا اور اپنے آپ کو شدید وعید کا سزاوار بنایا۔ امام نووی اس حدیث کی شرح میں زیاد کے متعلق فرماتے ہیں:

کان یعرف بزیاد بن عبید الثقفی ثم ادعاہ معاویۃ بن ابی سفیان والحقہ بابیہ ابی سفیان وصارمن جملۃ اصحابہ بعد ان کان من اصحاب علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ۔

(زیاد کا معروف نام زیاد بن عبید ثقفی تھا۔ پھر معاویہؓ بن ابی سفیان نے اس کے بارے میں دعویٰ کیا اور اس کا نسب اپنے والد ابوسفیانؓ کے ساتھ ملحق کر دیا۔ اس طرح زیاد امیر معاویہؓ کا ساتھی بن گیا حالانکہ پہلے وہ حضرت علیؓ کا ساتھ دیتا تھا)۔

اس حدیث کی شرح میں تقریباً یہی الفاظ مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم نے فتح الملہم میں درج فرمائے ہیں۔ یہی حدیث دیگر کتبِ صحاح میں بھی وارد ہے۔ مثال کے طور پر ابوداؤد، کتاب الآداب، باب فی الرجل ینتمی الی غیر موالیہ میں بھی یہ حدیث موجود ہے۔ مولانا خلیل احمد صاحب مرحوم بذل المجہود میں اس حدیث کی شرح یوں بیان فرماتے ہیں:

انما ذکر ابوعثمان ھٰذا الحدیث لابی بکرۃ لان زیاداً اخا ابی بکرۃ لامہ انتمی نسبہ الی ابی سفیان صخر بن حرب وقصتہ ان ابا سفیان زنی بامہ فی الجاھلیۃ فولدت زیاداً فکان زیاد تقول لہ عائشۃؓ زیاد بن ابیہ وکان زیاد من حماۃ علیؓ وکان شجاعاً مقداماً فی الحرب فاستمالہ معاویۃ فانتسب الیہ وجعلہ اخاہ فلھٰذا حدّث ابوعثمان ھٰذا الحدیث ابا بکرۃ لانہ ظن ان ابا بکرۃ لعلہ یرضی بہ فلما قال ابوبکرۃ انی سمعت ھٰذا الحدیث من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علم بھٰذا انہ لیس

موافق بما نقل زیاد ۔

(ابو عثمانؒ نے یہ حدیث حضرت ابو بکرہؓ سے اس لیے بیان کی کہ زیاد ان کا ماں شریک بھائی تھا اور اس نے اپنے نسب کا الحاق ابوسفیان سے کر لیا۔ اس کا قصہ یوں ہے کہ ابوسفیان نے جاہلیت میں زیاد کی والدہ سے زنا کیا تھا پھر زیاد پیدا ہوا تو زیاد کو حضرت عائشہؓ زیاد بن ابیہ کہا کرتی تھیں اور زیاد پہلے حضرت علیؓ کا حامی اور بہادر جنگجو تھا تو معاویہؓ نے اسے اپنی طرف مائل کیا، اپنے خاندان کی جانب اس کا انتساب کیا اور اُسے اپنا بھائی بنا لیا۔ اس لیے ابو عثمانؒ نے یہ حدیث ابو بکرہؓ سے بیان کی اور یہ سمجھ کر کی کہ شاید ابو بکرہؓ بھی اس استلحاق پر راضی ہیں لیکن جب انہوں نے خود یہی حدیث سنائی تو ابو عثمان نے جان لیا کہ وہ اس کارروائی پر خوش اور رضا مند نہیں ہیں۔")

اب محمد تقی صاحب اس بات پر بڑی برہمی کا اظہار کر رہے ہیں کہ مولانا مودودی نے یہ کیوں لکھ دیا کہ حضرت ابوسفیانؓ نے زیاد کی ماں سمیہ سے زنا کا ارتکاب کیا تھا اور پھر حضرت معاویہؓ نے زیاد کو اپنا حامی بنانے کے لیے اپنے خاندان کا فرد قرار دے دیا۔ مدیر البلاغ نے اس اندازِ بیان کو افسوسناک اور سخت مکروہ قرار دے کر مولانا مودودی سے توبہ و ندامت کا مطالبہ کیا تھا۔ میں نے پہلی بحث میں اس کا جواب دیتے ہوئے متعدد اصحابِ سلف کے اقوال نقل کیے تھے جن کا مفہوم مولانا مودودی کے مضمون سے مختلف نہ تھا۔ ان میں شاہ عبدالعزیز صاحب کی تحفہ اثنا عشریہ سے عبارت بھی شامل تھی جس میں انہوں نے زیاد کو "حرامی، نطفۂ ناتحقیق، مردود اور بے حیا لکھا تھا، جسے امیر معاویہؓ نے اپنے نسب میں شامل کر لینے کا لالچ دے کر حضرت علیؓ کی رفاقت سے جدا کر لیا تھا۔" مگر افسوس کہ عثمانی صاحب کو اب بھی اصرار ہے کہ یہ زنا نہیں بلکہ نکاح تھا اور اس "نکاح" کے دس گواہ موجود تھے، حالانکہ ان گواہوں میں سے بعض نے ایسی گواہی دی تھی جسے سن کر بقول مولانا آزاد مرحوم زیاد بھی شرما گیا۔ مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری تو اہلِ دیوبند کے استاذ الاساتذہ اور شیخ الشیوخ ہیں، وہ بھی فرما رہے ہیں کہ ابوسفیان نے زنا کیا تھا۔ اس کے باوجود مدیر البلاغ اسے نکاح ثابت کرنے پر ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔ مولانا خلیل احمد تو یہ بات لکھ چکنے کے بعد اب رحلت فرما چکے اور اس سخت مکروہ اندازِ تحریر سے وہ بھی توبہ و انابت کا اظہار نہ فرما سکے۔ مولانا محمد تقی صاحب جو مجھے اس بات کا الزام دیتے ہیں کہ میں ان کے اکابر پر طعن کرتا ہوں، ذرا اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھ لیں کہ جو تیر وہ ہم پر چلا رہے ہیں وہ بھی اس کا نشانہ اپنے اکابر کو تو نہیں بنا رہے؟

حقیقت یہ ہے کہ جو بات مولانا نے لکھی ہے، وہ بکثرت اہلِ علم لکھتے اور کہتے چلے آتے ہیں۔ مثال کے طور پر

حافظ ابن عساکر نے اپنی تاریخ میں زیاد کے حالات بیان کرتے ہوئے یہی کچھ لکھا ہے۔ انہوں نے اس کا ترجمہ زیاد ابن عبید کے نام سے کیا ہے جس سے میری اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ بکثرت مؤرخین نے زیاد بن ابی سفیان لکھنے سے احتراز کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: قال ابوسفیان لابی مریم بعد ان شرب عنده التمس لی بغیاً فجاء بها الیه فوقع بها فولدت زیاداً۔ (ابوسفیان نے شراب پینے کے بعد ابومریم سے کوئی رنڈی لانے کا مطالبہ کیا۔ وہ لے آیا۔ انہوں نے اس سے مباشرت کی اور زیاد پیدا ہوا)۔

پھر لکھتے ہیں کان ابن عمر و ابن سیرین یقولان زیاد ابن ابیه (حضرت عبداللہ ابن عمر اور ابن سیرین اس کو زیاد ابن ابیہ کہا کرتے تھے پھر ابن عساکر محدث ابن یحییٰ اور حضرت سعید بن المسیب کے اقوال نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

قال ابن یحییٰ اول حکم رُدّ من احکام رسول الله الحکم فی زیاد وقال سعید بن المسیب اول قضیة ردت من قضایا رسول الله صلی الله علیه وسلم علانیة قضاء فلان یعنی معاویة فی زیاد (ابن یحییٰ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں میں سے پہلا فیصلہ جو رد کیا گیا وہ زیاد کے بارے میں ہے اور سعید بن مسیب نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں میں سے اوّلین فیصلہ جسے علانیہ رد کیا گیا وہ معاویہؓ نے زیاد کے معاملے میں کیا)

مؤرخ ابوالفداء اپنی تاریخ ج ۲، ص ۹۸-۹۹ پر لکھتے ہیں: کانت سمیة جارية للحارث بن کلدة الثقفی فزوجها لعبید له رومی یقال له عبید فولدت سمیة زیاداً علی فراشه فهو ولد عبید شرعاً وکان ابوسفیان سار فی الجاهلية الی الطائف . . .

(سمیہ حارث بن کلدہ ثقفی کی کنیز تھی جسے اس نے اپنے ایک رومی غلام عبید نامی سے بیاہ دیا اور زیاد اسی عبید کے گھر پیدا ہوا اور شرعاً اسی کی اولاد تھا اور ابوسفیان جاہلیت کے دور میں طائف گئے . . . (آگے وہی قصہ ہے جو دوسرے مؤرخین نے بیان کیا ہے)۔ اس کے بعد ابوالفداء بیان کرتے ہیں کہ ابومریم نے استحلاق کے وقت اس طرح کی گواہی دی کہ زیاد نے خود اُسے خاموش کرا دیا فقال رویدك طُلبت شاهداً ولم تُطلب شتاماً (مجھے گواہی کے لیے طلب کیا گیا تھا نہ کہ گالیاں دینے کے لیے)۔ اس کے بعد ابوالفداء لکھتے ہیں:

فاستلحقه معاوية وهذه اوّل واقعة خولفت فيه الشريعة علانية لصريح قول النبی صلی الله علیه وسلم الولد للفراش وللعاهر الحجر واعظم الناس ذٰلك وانكروه خصوصاً بنوامية

لکھوں زیاد بن عبید الرومی صار من بنی امیۃ۔ (پھر معاویہؓ نے زیاد کا استلحاق کر لیا اور یہ پہلا واقعہ ہے جس میں علانیہ شریعت کی مخالفت کی گئی کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا صریح ارشاد ہے کہ بچہ اسی کا ہے جس کے بستر پر وہ پیدا ہوا اور زانی کے لیے پتھر ہے۔ لوگوں نے اس فیصلے کو بڑا حادثہ سمجھا اور اس پر احتجاج کیا، بالخصوص بنو امیہ نے، کیونکہ اس طرح رومی غلام عبید کا بیٹا زیاد بنو امیہ کا ایک فرد بن گیا۔)

افسوس کہ یہ سب حضرات توبہ کیے بغیر وفات فرما چکے اور اللہ کے ہاں پہنچ چکے ہیں۔ عثمانی صاحب ہی بہتر جانتے ہوں گے کہ ان کا انجام کیا ہو گا؟

کتبِ انساب کی شہادت | مدیر البلاغ نے دورانِ بحث میں یہ بھی لکھا ہے کہ "ملک صاحب کا یہ خیال درست نہیں ہے کہ بعد میں تاریخ و انساب کی کتابیں زیاد کو زیاد بن ابیہ اور زیاد بن عبید ہی لکھتی چلی آئی ہیں۔ مشہور عالم و مؤرخ بلاذری نے اپنی معروف کتاب انساب الاشراف میں زیاد کا ترجمہ زیاد بن ابی سفیان ہی کے عنوان سے کیا ہے۔" میرے اصل الفاظ یہ تھے کہ "تاریخ و انساب کی کتابوں میں عموماً زیاد بن ابیہ اور زیاد بن عبید ہی درج ہوتا چلا آیا ہے" اور میں اب بھی اپنی بات کو درست سمجھتا ہوں اور مؤرخ بلاذری کی طرف عثمانی صاحب کی منسوب کردہ بات کو غالطہ انگیز اور خلافِ واقعہ قرار دیتا ہوں۔ بلاذری کی پوری تاریخ ابھی تک مخطوطات کی شکل میں ہے اور اس کا مطبوعہ متداول حصہ وہ ہے جو جزءِ اول کی صورت میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب کی تحقیق سے دار المعارف، مصر ۱۹۵۹ء میں چھپا ہے۔ غالباً مدیر البلاغ کا اشارہ اسی کی طرف ہے مگر انہوں نے اس کے کسی متعین مقام کا حوالہ نہیں دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس جلد میں زیاد کا علیحدہ ترجمہ کسی مستقل عنوان کے تحت درج نہیں ہے کیونکہ یہ حصہ سیرتِ نبوی پر مشتمل ہے، البتہ ضمناً اس میں زیاد کا ذکر کئی مقامات پر آ گیا ہے۔ پوری کتاب میں شاید تیس بار زیاد کا نام آیا ہو گا مگر ان میں پوری تلاش کے باوجود مجھے صرف صفحہ ۴۶۷ کے ایک مقام پر یہ الفاظ ملے ہیں کہ حضرت ابو بکرہؓ زیاد بن ابی سفیان کے اخیافی بھائی ہیں۔ اس ایک جگہ کے سوا زیاد کی ولدیت کہیں ابو سفیان نہیں، بلکہ اکثر جگہ زیاد بن عبید ہے۔ ص ۴۸۹ پر یہی بات درج ہے کہ سمیّہ کی شادی رومی غلام عبید سے ہوئی تھی: بقال لہ عبید فولدت منہ زیاداً (اس غلام کا نام عبید تھا جس سے زیاد پیدا ہوا)۔ آگے صفحہ ۴۹۱ پر ہے: زیاد بن عبید مولی ثقیف۔ پھر صفحہ ۴۹۳ پر حضرت ابو بکرہؓ کا قول درج ہے کہ زیاد کے فسق و فجور میں علاوہ دیگر باتوں کے یہ بھی ہے کہ اس نے اپنے باپ عبید کے نسب سے انکار کیا اور ابو سفیان کا بیٹا

ہونے کا دعویٰ کیا۔ (استفاءہ من عبید و ادّعاہ الی ابی سفیان)۔ اس کے بعد ہر شخص خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ مدیر البلاغ کا یہ مزعومہ کسی حد تک درست ہے کہ بلاذری نے زیاد کا ترجمہ زیاد بن ابی سفیان ہی کے عنوان سے کیا ہے۔ فی الحقیقت بات یہ ہے کہ زیاد جس کا بھی نطفہ ہو وہ عُبید ہی کے گھر پیدا ہوا اور اس کا نسب یقینی طور پر عبید سے ملحق تھا۔ اب زیاد اور امیر معاویہؓ نے مل جل کر استلحاق کی جو کارروائی کی، اس سے کسی ناجائز حق تلفی کی تلافی نہیں ہوتی جیسا کہ مدیر البلاغ کا خیال ہے، بلکہ یہ زیاد کے ساتھ شاید زیادتی ہی ہوئی کہ اس کا نسب مستقل طور پر دو غلا اور خلط ملط ہو گیا۔ ایک کے بجائے اس کے لیے چار چار ولدیتیں لکھنے کی گنجائش پیدا ہو گئی۔ کسی نے زیاد بن عبید کہا، کسی نے ابن ابی سفیان کہا اور کسی نے ان دونوں سے بچ کر یوں کہہ دیا کہ زیاد ابن ابیہ یا ابن اُمّہ (اپنی ماں یا اپنے باپ کا بیٹا، جو بھی اس کا باپ ہو)۔ استلحاق سے شاید دنیوی فائدہ زیاد نے حاصل کر لیا ہو مگر اس کا نسب دائماً مشتبہ ہو کر رہ گیا۔

بلاذری نے جیسا کہ میں نے بیان کیا زیاد کا مستقل ترجمہ یا نسب درج نہیں کیا اور یہ کتاب اس موضوع کے لیے مختص بھی نہیں مگر امام ابن حزم کی کتاب "جمہرۃ انساب العرب" خاص انساب کے موضوع پر ہے۔ یہ بھی دار المعارف، مصر میں ۱۳۸۲ھ میں چھپی ہے۔ اس کے صفحہ ۱۱۱ پر ولد حرب بن امیہ بن عبد شمس کے زیر عنوان حضرت ابو سفیان کی جملہ اولاد کی پوری تفصیل درج ہے۔ نام یہ ہیں: یزید، حنظلہ، عمرو، معاویہ، محمد، عنبسہ، عتبہ، ام حبیبہ۔ اس فہرست میں زیاد کا نام مفقود ہے۔ ابو حنیفہ دینوری اپنی تاریخ الاخبار الطوال ص ۱۱۸ پر لکھتے ہیں: زیاد بن عبید، کان عبداً مملوکاً لثقیف۔ پھر ص ۲۱۹ پر انہوں نے زیاد کے لیے الگ ترجمہ درج کیا ہے اور عنوان زیاد بن ابیہ قائم کیا ہے۔ اس کے آغاز ہی میں لکھتے ہیں: کان زیاد بن ابیہ انما یعرف بزیاد بن عبید۔ پھر لکھتے ہیں کہ عبید غلام تھا، مالک نے آزاد کر دیا تو اس نے سمیہ سے نکاح کیا جس سے زیاد پیدا ہوا۔ حافظ ابن حجر الاصابہ میں زیاد کا ترجمہ یوں لکھتے ہیں:

زیاد بن ابیہ وھو ابن سمیۃ الذی صار یقال لہ ابن ابی سفیان، ولد علی فراش عُبید مولی ثقیف فکان یقال لہ زیاد بن عبید، ثم استلحقہ معاویۃ ثم لما انقضت الدولۃ الامویۃ صار یقال لہ زیاد بن ابیہ و زیاد بن سمیۃ ... اشتری اباہ بالف درھم فاعتقہ۔

(زیاد بن ابیہ جو سمیّہ کا بیٹا تھا، بعد میں اسے ابن ابی سفیان کہا جانے لگا۔ وہ بنو ثقیف کے غلام عُبید

کے بستر پر پیدا ہوا۔ اس لیے اُسے زیاد بن عبید کہا جاتا تھا۔ پھر معاویہؓ نے اس کا استلحاق کیا۔ جب بنو امیہ کی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا تو پھر اسے زیاد بن ابیہ اور زیاد بن سمیّہ کہا جانے لگا۔ اس نے اپنے باپ عُبید کو ایک ہزار درہم دے کر آزاد کرایا تھا)۔

ابن حجر کے اس بیان سے یہ بات واضح ہو گئی کہ زیاد کا باپ عبید ہی تھا اور وہ استلحاق سے پہلے اسی کا بیٹا کہلاتا تھا۔ امیر معاویہؓ کے استلحاق سے اُسے ابن ابی سفیان کہا جانے لگا مگر اموی سلطنت کے خاتمے پر اُسے دوبارہ عبید کا بیٹا کہا جاتا تھا۔ آگے ابن سیرین کے متعلق بھی صحیح سند کے ساتھ نقل ہے کہ زیاد کو ابن ابیہ ہی کہا جاتا تھا۔ عثمانی صاحب کو شاید یہ بھی یاد نہ رہا ہو کہ البلاغ، ربیع الاول ۱۳۸۹ھ میں انہوں نے اپنی بحث کے آخر میں خود امیر معاویہؓ کا ایک خط زیاد کے نام نقل کیا ہے جس میں وہ زیاد کو لکھتے ہیں:

جس باپ کی طرف تم پہلے منسوب تھے وہ حسنؓ کے والد سے زیادہ اس خطاب کے مستحق تھے

کیا اس کا صاف مطلب یہ نہیں ہے کہ امیر معاویہؓ خود بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتے تھے کہ استلحاق سے پہلے زیاد اپنے باپ عبید ہی سے انتساب رکھتا تھا۔ اس کے بعد آخر استلحاق کی کارروائی کا کیا جواز رہ گیا اور وجہ و محل باقی رہ جاتا ہے؟ مشہور مورخ اسلام امام ذہبی اپنی تصنیف العبر فی خبر من غبر جلد اول ص ۵۸ پر ۵۳ھ کے واقعات بیان کرتے ہوئے جہاں زیاد کی وفات کا ذکر کرتے ہیں وہاں اُسے زیاد بن ابیہ ہی لکھتے ہیں۔ اگرچہ ساتھ فرماتے ہیں استلحقہ معاویۃ وقال انہ ولد ابی سفیان (معاویہؓ نے اس کا استلحاق کیا اور دعویٰ کیا کہ وہ ابوسفیان کا لڑکا ہے)۔ آگے چل کر ص ۷۰، پر ۶۷ھ کے واقعات درج کرتے ہوئے عبیداللہ بن زیاد کے ذکر میں پھر زیاد کا نام آگیا ہے، تو پھر بھی امام ذہبیؒ نے زیاد بن ابیہ ہی لکھا ہے۔

محمد تقی عثمانی صاحب نے اس اشکال کو بھی بڑے شد و مد کے ساتھ پیش کیا ہے کہ اگر یہ استلحاق ناجائز تھا تو حضرت عائشہؓ نے زیاد کو ابن ابی سفیان لکھ کر کیسے[1] اس پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی؟ میں اس کا جواب پہلے دے چکا کہ یہ فیصلہ گو غلط ہی تھا مگر جب امیر معاویہؓ نے تمام مملکت میں اعلان کرا دیا کہ زیاد کو سب لوگ زیاد بن ابی سفیان کہا کریں تو دنیوی اعتبار سے یہ واقعہ نافذ ہو گیا اور اس کے مطابق زیاد بن ابی سفیان کہنا بھی حدِ جواز میں آگیا۔ عثمانی صاحب کو شاید معلوم ہو گا کہ فقہائے احناف کا اس پر اتفاق ہے کہ حاکم و قاضی کا فیصلہ خواہ وہ غلط ہی کیوں نہ ہو ظاہراً و باطناً نافذ ہو جاتا ہے اور اس کے مطابق عمل کرنا

---

[1] یہ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کا قول ہے جسے مدیر البلاغ نے خود تحفہ اثنا عشریہ سے نقل کیا ہے۔

جائز ہو جاتا ہے، اگرچہ عند اللہ جو فیصلہ غیر صحیح ہے وہ غیر صحیح ہی رہے گا۔ پھر میں یہ بات بھی پہلے بیان کر چکا ہوں کہ بعض روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے زیاد ابن ابی سفیان کہنے سے گریز فرمایا ہے۔ چنانچہ زیاد نے ایک دفعہ حضرت عائشہ صدیقہ کی خدمت میں ایک خط بھیجا اور اس کے آغاز میں لکھا: "زیاد بن ابی سفیان کی جانب سے" اُسے توقع تھی کہ حضرت عائشہ اسے اسی نام سے خطاب کریں گی اور اس کے لیے ثبوت ہو جائے گا۔ مگر حضرت عائشہؓ نے اس کا جواب بھیجا تو لکھا "سب مسلمانوں کی ماں عائشہؓ کی طرف سے زیاد بیٹے کے نام"۔ عثمانی صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ جب گواہوں نے نکاح کی گواہی دے دی تو جو لوگ استلحاق زیاد پر معترض تھے انہوں نے اعتراض سے رجوع کر لیا۔ اور اپنے سابق اعتراض پر شرمندگی کا اظہار کیا۔ مگر عثمانی صاحب کی یہ بات صحیح نہیں ہے۔ میری بحث سے یہ واضح ہے کہ جن حضرات نے استلحاق کی کارروائی کو ناجائز سمجھ کر اس پر اعتراض و احتجاج کیا، وہ آخر دم تک اپنے موقف پر قائم رہے۔ حضرت اُمِّ حبیبہؓ جو اُمّ المومنینؓ اور ابوسفیان کی صاحبزادی ہیں انہوں نے ہمیشہ زیاد سے پردہ فرمایا اور اسے اپنا بھائی تسلیم نہ کیا۔ پھر اعتراض تو پیدا ہی اس کارروائی کے بعد ہوا، اس لیے مدیر البلاغ کا یہ قول کتنا عجیب ہے کہ جب معاملہ دس گواہوں سے ثابت ہو گیا، تو معترضین نے رجوع کر لیا۔ جو لوگ نکاح ہی کے منکر تھے، مثلاً حضرت ابوبکرہؓ کے نزدیک تو یہ گواہی تہمتِ زنا کے مترادف تھی۔ اسی طرح صاحب نیل المجہود جب یہ کہتے ہیں کہ ابوسفیان نے زنا کیا تھا تو ان کے نزدیک بھی یہ شہادت زنا ہی کی ہو گی نہ کہ نکاح کی جس رجوع و ندامت کا ذکر مروان کے بھائی عبدالرحمٰن اور ابن مفرغ کے سلسلے میں محمد تقی عثمانی صاحب کر رہے ہیں، اس کی حقیقت بس اتنی ہے کہ بنو امیہ نے اس استلحاق کو پسند نہیں کیا تھا، کیونکہ اس طرح ایک غیر قبیلے کا فرد ان میں داخل کر دیا گیا تھا، تو انہوں نے ایک نظم پڑھنی شروع کر دی جس میں اس کارروائی کی مذمت تھی۔ اس کے اشعار بعض دفعہ عبدالرحمٰن بن حکم اور بعض دفعہ ایک حمیری شاعر زیاد بن مفرغ کی طرف منسوب کیے جاتے تھے۔ عبدالرحمٰن نے ان کے انتساب سے کبھی انکار نہیں کیا بلکہ وہ یہی کہتا رہا کہ "اے معاویہؓ اگر آپ کو حبشی بھی مل جائیں تو آپ انہیں بھی ہمارے خاندان میں ملا کر ہماری تذلیل کرتے رہیں گے" جہاں تک ابن مفرغ کا تعلق ہے۔ اس کے الفاظ بھی استیعاب میں یہ منقول ہیں کہ اس نے امیر معاویہؓ کے سامنے صرف یہ کہا کہ میں نے یہ اشعار نہیں کہے بلکہ عبدالرحمٰن نے کہے ہیں اور میری طرف منسوب کر دیئے ہیں۔ اس صفائی و براءت کو عثمانی صاحب نے شرمندگی کا نام دے دیا ہے۔ بہر کیف ایک بات اگر قابلِ اعتراض ہے

تو وہ محض اس بنا پر قابلِ تحسین و تائید نہیں ہو جاتی کہ اس کے معترضین میں سے کوئی اپنے اعتراض سے دستبردار ہو گیا ہے۔

الوَلَدُ لِلفِراش | میں نے اپنی سابق بحث میں حضرت سعدؓ اور حضرت عبدؓ بن زمعہ کا واقعہ بھی بیان کیا تھا کہ ان دونوں کے مابین ایک بچے کی ولدیت کا جھگڑا تھا۔ بخاری کتاب المیراث اور دوسری احادیث میں مذکور ہے کہ حضرت سعدؓ یہ کہتے تھے کہ بچہ ان کے بھائی عُتبہ کا ہے (اگرچہ وہ زمعہ کی لونڈی کے بطن سے ہے)۔ دوسری طرف عبدؓ بن زمعہ کہتے تھے کہ وہ میرا بھائی ہے کیونکہ میرے والد کے گھر (بستر) پر پیدا ہوا ہے اور لونڈی میرے والد کی مملوکہ تھی۔ اگرچہ اس بچے کی شکل عتبہ سے ملتی جلتی تھی، مگر اس کے باوجود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بچہ حضرت عبدؓ بن زمعہ ہی کے سپرد فرمایا۔ اس حدیث سے قطعی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ اس ارشادِ نبویؐ کے بعد نسب کے معاملے میں جو قضیہ بھی درپیش ہوگا اس میں نسب اُسی شخص سے ملحق ہوگا، مولود کی والدہ جس کی مملوکہ یا منکوحہ ہے۔ مگر مجھے حیرت و افسوس ہے کہ عثمانی صاحب اس پر بھی فرماتے ہیں کہ زیادؓ کے معاملے میں ابوسفیان کے سوا کسی اور کا اقرارِ نسب ثابت نہیں۔ جب عبید، جس کے فراش پر زیاد پیدا ہوا تھا، وہ خود خاموش رہے تو اب دعویٰ صرف ابوسفیان کا ہے اور وہ اسلام سے قبل ہو چکا تھا۔ اس لیے وہ قابلِ قبول ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ جب زیاد عبید ہی کے ہاں پیدا ہوا، وہی اس کا باپ تھا، اُسی کے ہاں زیاد پروان چڑھا، اسی باپ کو اس نے غلامی سے آزاد کرایا اور پورے چالیس برس تک وہ زیاد بن عبید کہلاتا رہا، اگر یہ اقرارِ نسب نہیں تو پھر ابوسفیانؓ کا چند آدمیوں کے کان میں یہ کہہ دینا کہ زیاد میرے نطفے سے ہے، یہ کس طرح کا اقرارِ نسب ہے؟ پھر یہ بات بھی کیا لاجواب ہے کہ "عبید خود خاموش ہے"۔ استلحاق و ادّعا کی کارروائی سے پہلے عُبید کیا عام منادی کراتا یا کسی عدالت میں دعویٰ کرتا کہ زیاد میرا بیٹا ہے؟ کیا ہر باپ اپنے بیٹے کا نسب اسی طرح ثابت کرتا ہے؟ اور اگر عثمانی صاحب کا مطلب یہ ہے کہ قضیۂ استلحاق کے وقت "عبید خاموش ہے"، تو اس کی خاموشی سے پہلے اُس وقت اُس کی زندگی کا ثبوت بھی عثمانی صاحب کو فراہم کرنا ہوگا۔ جس وقت زیاد کی عمر چالیس سے متجاوز ہو چکی، اس وقت تو شاید ابوسفیان کی طرح عبید اور سمیّہ دونوں شہرِ خموشاں کے مکین بن چکے ہوں گے اور ان کی خاموشی کو گویائی میں تبدیل کرنا کسی کے بس میں نہ ہوگا۔

میں اس سے پہلے شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی، قاضی زین العابدین صاحب، مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی، مولانا ابوالکلام آزاد صاحب کے اقوال اس مسئلے میں پیش کر چکا ہوں۔ اب میں آخر میں مولانا عبدالرشید صاحب نعمانی کی ایک عبارت نقل کر کے اس بحث کا خاتمہ کر رہا ہوں۔ مولانا موصوف نے محمود احمد عباسی کے رد میں ایک مفصل مضمون "بیّنات" میں بالاقساط سپردِ قلم کرنا شروع کیا تھا جس کا عنوان تھا: "ناصبیت تحقیق کے بھیس میں"۔ یہ بڑے مفید مباحث پر مشتمل تھا مگر نہ معلوم بیچ ہی میں کیوں منقطع ہو گیا۔ عباسی صاحب نے ابن قتیبہ کی کتاب

المعارف کے حوالے سے لکھا تھا کہ ”سمیہ کا جاہلیت کے مروّجہ نکاحوں میں سے ایک قسم کا نکاح ابوسفیانؓ سے ہوا جس سے زیاد پیدا ہوتے۔“ اس پر مولانا محمد عبدالرشید صاحب نعمانی نے شعبان ۱۳۸۲ھ کے ”بینات“ میں جو تبصرہ فرمایا تھا اس کا ضروری حصہ درج ذیل ہے

”یہ بات معارفِ ابن قتیبہ میں مذکور نہیں۔ جناب مؤلف (عباسی صاحب) نے اپنی طرف سے اس عبارت کو بڑھا کر خواہ مخواہ یزید کی تکذیب کی۔ یزید کا دعویٰ تو یہ ہے کہ ”ہم نے زیاد کو ثقیف کی ولاء سے قریش کی طرف اور زیاد بن عبید کے انتساب سے حرب[1] بن امیہ کی طرف منتقل کیا۔ زیاد کی ماں سمیہ حارث بن کلدہ ثقفی کی کنیز تھی اس کا باپ عُبید قبیلۂ ثقیف کا غلام تھا۔ زیاد کا ایک شاندار کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اپنے باپ عبید کو ایک ہزار درہم میں آزاد کرایا۔ چونکہ یہ اپنے باپ عُبید کے یہاں پیدا ہوا تھا، اس لیے اس کو زیاد بن عبید کہا جاتا تھا۔ اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ یزید کا مطلب ان طعنوں سے کیا تھا اور وہ زیاد پر کیا چوٹ کر رہا تھا۔ بات تو صحیح ہے۔ وہ یہ کہہ رہا ہے کہ زیاد یہ محض ہماری بندہ پروری ہے کہ ہم نے تجھ کو ابوسفیان کی اولاد بنا کر حرب بن امیہ کی نسل میں شامل کر لیا اور ہماری اس کارروائی کی بنا پر تیرا شمار قریش میں ہونے لگا ورنہ تو قبیلۂ ثقیف کے عبید نامی ایک غلام کا لڑکا تھا۔ مؤلف یہاں حضرت ابوسفیانؓ کی داستانِ نکاح سنانے بیٹھ گئے۔ ظاہر ہے کہ اگر ان سے اس کی ماں کا نکاح ہوا تھا تو وہ اپنے لختِ جگر کو مرتے دم تک اس طرح ایک غلام کی فرزندی میں کس طرح دیکھ سکتے تھے۔ ان کو چاہیے تھا کہ عہدِ نبوی ہی میں اس مسئلے کو اٹھاتے اور اپنے نورِ دیدہ کو اپنی فرزندی میں لے لیتے۔ یا پھر شیخین رضی اللہ عنہما کے زمانے میں اس کا اظہار کرتے تاکہ شرع کے مطابق اس غریب کا نسب ثابت ہو جاتا۔ یہ عجیب نکاح ہے جس کا نہ ناکح کو پتہ ہے نہ منکوحہ کو۔ نہ خود اس لڑکے کو جو اس نکاح سے پیدا ہو۔ بس ایک مؤلف کو معلوم ہے۔“

میں مولانا نعمانی صاحب کے تبصرے پر صرف اتنا اضافہ کروں گا کہ اس ”عجیب نکاح“ اور اس مخفی بھید کے رازداں اب اکیلے مؤلف مذکور ہی نہیں ہیں بلکہ مدیر البلاغ بھی ہیں۔ ان کو محمود احمد عباسی کی ہمنوائی مبارک ہو۔

---

[1] حرب ابوسفیانؓ کا اصل پیدائشی نام ہے۔

خـــالی صفحـــه